تعبیرِ نصوص کا قدیم اور جدید منہج

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
شعبہ علومِ اسلامیہ، جامعہ کراچی

قرآن مجید انسانوں کے لئے جہاں الٰہی ہدایات کا بے مثال مجموعہ ہے، وہیں وہ اپنے سرچشمۂ علم وحکمت سے فیضیاب ہونے والوں کے لئے، قانون سازی کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ جس کی نظیر، کسی بھی کتاب کی شکل میں، دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قرآن مجید کی نصوص سے قانون سازی کا عمل، اسلامی معاشرت آسائی کے لئے ناگزیر لازمے کے طور پر، ہر دور میں ہوتا آیا ہے، اور آج بھی جاری وساری ہے۔ قدیم فقہاء نے متعلقاتِ نصوص میں عبارت، اقتضاء، دلالت اور اشارت نیز دیگر اصولوں کے پیشِ نظر اپنے اپنے اجتہادات پیش فرمائے۔ پھر انہی متعلقات واُصول کے اندر رہتے ہوئے اہلِ فقہ کے مائنڈ سیٹ (Mind Set) نے بیشمار کتابیں تخلیق کر ڈالیں جو اپنے اپنے زمانوں میں ''ہدایت وقانون'' کے درجے پر فائز ہوئیں اور کثیر تعداد میں خلقِ خدا ان سے مستفیض ہوئی۔ ان نصوص کی تعبیرات میں علماء وفقہاء کے مابین اختلافات بھی ہوتے رہے اور علّتِ احکام کے تعین میں متعدد اور مختلف اصول بھی سامنے آتے رہے۔ (۱) اجتہادات اور قانون سازی کے اس عمل میں قرآنی نصوص کو بہر حال کلیدی اہمیت حاصل رہی۔ تغیرِ زمان ومکان، چونکہ ایک فطری عمل ہے اس لئے ضروری نہیں کہ کسی مقام یا کسی عہد کی قانون سازی کو ابدیت کا شرف بھی حاصل ہو۔ البتہ شرفِ ابدیت نصوص کو ضرور حاصل ہے جو قیامت تک رہے گا۔

واضح ہو کہ تعبیرات کا عمل، انسانی فہم وفراست سے عبارت ہے۔ جو اقدام وخطا کے درمیان ہوتی ہے اور صد فیصد یقینی صحت واصابت سے محروم بھی۔ جبکہ ہر دور کا مسلمان، اپنے جملہ مسائل کے حل میں بنیادی طور پر نصوص سے رہنمائی کا طلب گار نظر آتا ہے۔ اس لئے ضروری ٹھہرا کہ نصوص کو پرکھنے، سمجھنے اور اخذِ ہدایت کے لئے قدیم اُصولوں کے ساتھ ساتھ کچھ جدید رہنما اصول بھی مدوّن کئے جائیں تاکہ انسانوں کو مطلوب ممکنہ رہنمائی میسّر آئے۔

نصوص سے رہنمائی کے لئے سب سے پہلے قرآنی الفاظ کا مطالعہ ضروری ہے۔ بعض الفاظ مختلف النوع معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعینِ معنیٰ کے لئے سیاق وسباق (Context) کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ واضح ہو کہ سیاق وسباق سے مراد ''نظم'' ہے نہ کہ کوئی مخصوص واقعہ یعنی معاشرتی تاریخی حوالہ، جسے بالعموم شانِ نزول کے نام سے بیان کر دیا

جاتا ہے۔ یہ نظم، قرآنِ مجید کی ترتیبِ کتابی سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن اگر ترتیبِ نزولی کے ساتھ مرتب ہوتا تو بلاشبہ اس میں شانِ نزول کی ضرورت واہمیت، سرِ فہرست ہوتی بلکہ بایں صورت، مخصوص واقعات ہی تفہیمِ مطالب میں کلیدی کردار ادا کرتے۔ مگر اس عمل سے قرآن کی عمومیت اور وسعت متاثر ہو جاتی اور قرآنِ مجید بعض مخصوص پس منظر میں محدود ہو کر، ماضی کا مقدس ریکارڈ بن جاتا۔ اسی لئے قرآن مجید کو ترتیبِ نزولی کی بجائے ترتیب کتابی پر نہایت عمدہ طریقے سے مرتب کیا گیا۔

کذٰلک لنثبت بہ فؤادک ورتلناہ ترتیلاO(الفرقان/ ۳۲)

تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کریں اور (اسی وجہ سے) ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب سے مرتب کیا ہے۔

قرآنِ مجید کی کتابی ترتیب چونکہ توقیفی ہے اس لئے خدا نے اس ترتیب کو خود اپنے آپ سے منسوب کیا ہے۔ امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے الرتل کا معنیٰ لکھا ہے۔ الرتل و الساق الشی ءِ و انتظامه' علی استقامةٍ، (۲) کسی چیز کا حسنِ تناسب کے ساتھ منتظم اور مرتب ہونا۔ ابن منظور افریقی (متوفی ۷۱۱ھ) کے بقول رتل، کسی چیز کی ترکیب کا حسن ہے اور رتل الکلام کے معنیٰ ہیں۔ اس کی تالیف کو خوب کیا اور اسے واضح کیا اور اس میں آہنگی اختیار کی۔ (لسان العرب) ایک مشہور انگلش، عربی ڈکشنری میں رتلنا کا معنیٰ لکھا ہے۔

"He puts together and arranged well the component parts of the speach. (3)"

ورتلناہ ترتیلا کے معنیٰ پروفیسر محمد یٰسین نے اپنے انگریزی ترجمے میں یہ کئے ہیں:

"And we have revealed it is a well-ordered gradual manner and composed it excellently. (4)"

ایم۔ ایچ شاکر نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں مذکورہ بالا آیت کو بایں الفاظ ٹرانسلیٹ کیا ہے:

"We have arranged it well in arranging. (5)"

اور مشہور انگریزی مترجم عبداللہ یوسف علی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"We have rehearsed it to them in slow, well-arranged stages, gradualy."

اور اس فقرے کے حاشیے میں لکھا ہے۔

Slow, well-arranged stages: though the stages were gradual, as the

occasion demanded from time to time, in the course of twenty three years, the whole emerged, when completed, as a well-arranged scheme of spiritual instruction, as we have seen in following the arrangement of the surahs. (6)"

واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں عصری ضرورتوں کے ساتھ ساتھ آئندہ زمانوں کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک شانِ نزول کا معاملہ ہے اس کی تفہیم یہ ہے کہ وہ بالعموم آیات کو ان واقعات و حالات میں مقید نہیں کرتا، جو اس کے لئے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ فلاں واقعہ یا معاملے پر ان آیات کو منطبق کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتبِ روایات میں بعض آیات کے شانِ نزول میں متعدد واقعات رپورٹ ہوئے ہیں، جو دراصل ہمیں یہی بتاتے ہیں کہ قرآن بالعموم اپنے نزول میں حالاتِ عمومی اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے نہ کہ مخصوص واقعے یا معاملے کو۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید، کسی واقعے کے صدور کا انتظار نہیں کرتا کہ فلاں واقعہ پیش آئے تب وہ اترے۔ پس نزولِ قرآن کو کسی مخصوص واقعے پر منحصر کرنا، اسکی آفاقیت، جامعیت وسعت اور عمومیت کو قدرے کم کر کے پیش کرنا ہے۔ جسٹس تنزیل الرحمٰن کے الفاظ میں ''قاعدہ یہ ہے کہ آیتِ قرآنی اپنے عموم پر قائم رہتی ہے اور شانِ نزول اس کا صرف ایک پہلو یا جزو ہوتا ہے۔'' (۷) جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۶ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت تمیم داری اور اسکے بھائی عدی کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ اصلاً یہ کہنا چاہیئے کہ وہ واقعہ بھی اسی آیت کے تحت مذکور ہوا ہے۔ اس طرح آیت اپنے عموم پر رہے گی اور شانِ نزول، اپنے معاشرتی تاریخی پس منظر کو بھی سمجھا دے گا۔

قرآن سے رہنمائی کے مآخذ اصولوں میں ایک رہنما اصول ''تصریفِ آیات'' کا بھی ہے۔ جس میں الفاظ اپنے تنوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ پھر الفاظ کا یہ تنوع، اپنے قاری کو معنیٰ و مفہوم کی وسعتوں میں لے جاتا ہے۔ جس میں شریعت کے مقاصد و مصالح کو پیشِ نگاہ رکھنا ہی قانون سازی کی راہ میں بنیادی قدم ہوتا ہے۔ تصریفِ آیات میں مخصوص الفاظ کا مطالعہ اپنے ماقبل اور مابعد کے ساتھ اتنا ضروری ہے کہ اس کے بغیر، تفہیم مطالب تک پہنچنا ناممکن ہے۔

تصریفِ آیات کا اصول ان آیات میں وارد ہوا ہے۔ (الاسراء/۴۱۔۸۹، الکہف/۵۴۔طٰہٰ/۱۱۳۔ الفرقان/۵۰۔ الانعام/۴۶۔۶۵۔۱۰۵۔ الاعراف/۵۸) مگر ہم نے اس اصول کو بیان کرنے کے لئے، درج ذیل آیت کو منتخب کیا ہے۔

ولقد صرفنا فی هٰذا القراٰن لیذکروا. (الآیت) (الاسراء/۴۱)

ہم نے اس قرآن میں (حقائق و واقعات اور حِکَم و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کیلئے) طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ تا کہ لوگ اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔

کیونکہ اس طرح کسی بھی حقیقت یا اصل کے جملہ پہلو، لوگوں کی نگاہ میں آجاتے ہیں۔قرآنِ کریم نے اپنے مطالب و مفاہیم کو واضح کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اس کے متعدد گوشے سامنے آجائیں۔یہ طریقہ ہدایت فطری بھی ہے اور تجسس آمیز بھی۔اس ''اصول'' کے تحت قاری کی تمام تر توجہات کا مرکز، کلامِ الٰہی ہوتا ہے۔جس کی روشنی میں اسے اپنے عہد کے جملہ مسائل کا حل دریافت ہوتا نظر آتا ہے۔وہ پیش آمدہ حالات و واقعات کے تناظر میں، قرآنی حل کی طرف بڑھتا ہے پھر قرآن کا یہ اصول اپنی طرف بڑھنے والوں کو مایوس نہیں کرتا، بلکہ اجتہادی رہنمائی کے دروازے ان پر کھول دیتا ہے۔

تصریفِ آیات کا مقصد ''لیذ کروا'' کے لفظ سے واضح کیا گیا ہے۔دراصل یہ تذکیر ہی تو ہے جو ہمیں ہدایت پر آمادہ کرتی اور قرآن سے جوڑے رکھتی ہے۔اگر قرآنی نصوص سے اجتہادی رہنمائی مفقود کر دی جائے تو قرآن، محض الفاظ کی قرأت تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔جس کا مقصد ثواب کے حصول کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔اسی لئے تو قرآن نے اپنے اکثر مشمولات و مندرجات کو یہ اصولِ تصریف، تذکیر سے ملحق رکھا ہے۔

اصولِ تصریف میں الفاظ کے معنیٰ کا تعین، سیاق و سباق کے ساتھ ہی ممکن ہوتا ہے۔اس لئے ایسے تمام مقامات کو جمع کرنے کے بعد ہی قاری کو صحیح اور مکمل فہم حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآنی نصوص کو جدید منہج میں سمجھنا، خود جدیدیت کا تقاضا ہے۔کیونکہ قرآن ہر جدید سے بڑھکر جدید کتاب ہے۔عصرِ حاضر کی برق رفتار ترقی اور بدلتے ہوئے حالات میں قرآن مجید سے استدلال کے نئے نئے زاویے از خود، ہمارے سامنے آرہے ہیں۔مثلاً سورۃ الواقعہ میں آتا ہے:

نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین○علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فی مالا تعلمون○(الواقعہ ۶۰،۶۱)

ہم نے تمہارے درمیان موت مقرر کر دی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں اور تمہیں اس صورت میں پیدا کریں، جو تم نہیں جانتے۔

بنیادی طور پر یہ آیات، حیات بعد الموت کے موضوع پر غور و فکر کا سامان لئے ہوئے ہیں۔مگر ان میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ ہماری دوسری بعثت میں ہماری شکل و صورت وہ نہیں ہوگی، جو آج دنیا میں ہے۔یعنی نہ تو یہ شکل و صورت ہوگی اور نہ یہ جسم جسامت۔کیونکہ ویسے بھی ہماری شکل و صورت اور جسم و جسامت ہر آن تغیر پذیر ہے۔اور ہم خود کو شعورِ عینیت کی بنیاد پر جان رہے ہوتے ہیں۔گویا قیامت میں بھی یہی شعورِ عینیت ہماری پہچان کی بنیاد بنے گا۔اور ہم مختلف شکلوں کے باوجود، ایک دوسرے کو اور خود کو پہچان رہے ہوں گے۔

یہ ہے آیات کا صاف اور بدیہی مطلب۔ مگر موجودہ زمانے کی میڈیکل سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے ہمیں ایک حیاتیاتی معاشرتی ضرورت پر اجتہادی فکر کا رستہ بھی دکھایا ہے اور وہ ہے، اعضاء کی پیوند کاری (Transplantation) کیونکہ جب ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ مرنے کے بعد ہم ''جسمِ موجودہ'' کے ساتھ نہیں بلکہ کسی جسمِ مثالی کے ساتھ اٹھائے جائیں گے تو مرنے والے کے لئے اُسکے جسم کے کسی حصے کو ٹرانسپلانٹ کرنے کی وصیت کرنا نہ صرف جائز بلکہ کسی زندہ کی ایسی مدد بھی ہوسکتا ہے، جس پر صدقۂ جاریہ کا اطلاق ہوسکے۔ مُردوں کے فیض پہنچانے کی یہ جدید صورت موجودہ سائنسی ترقی کی بدولت ہی ممکن ہوسکی ہے۔ ہمارے خیال میں نصوص سے استدلال کا یہ منہج، قدیم دور میں (اپنی قدامت کے سبب) ناممکن تھا۔ یہ استدلال، جدید دور کی پیداوار ہے۔ اور اس کتاب کے ''زندہ کتاب'' ہونے کی بیّن دلیل بھی۔

قرآنی نصوص سے استدلال کا ایک طریقہ، روایات کے ذریعے علم وفہم کا حصول بھی ہے۔ اس منہج میں قرآن کو روایات کے زیرِ اثر رکھا جاتا ہے اور روایات کے ذریعے ہی قرآنی مطلوبات کو سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ایک دوسرے منہج میں روایات کی جانچ پڑتال، خود آیات سے کی جاتی ہے۔ کسی روایت کے صحیح ہونے بلکہ کتنی صحیح اور کتنی غیر صحیح ہونے کی سند بھی عقلِ سلیم اور قرآنِ کریم کی رُو کی جاتی ہے۔ بالخصوص اختلافِ روایات کی صورت میں، قرآنِ کریم کے الفاظ کو پیشِ نظر رکھنا ہی جدید منہج کا تقاضا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر میں ملائکہ نے قتال میں حصہ لیا یا نہیں؟ اس ضمن میں مختلف روایات سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ملائکہ نے انسانوں کی صورت میں، اس غزوہ میں حصہ لیا اور عملاً قتال کیا۔ جبکہ قرآنِ کریم کی صراحت اس کے خلاف ہے۔ قرآنی الفاظ کے مطابق:

اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین امنوا . (الانفال/ ۱۲)

جب آپ کا رب، فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پس جو ایمان لائے، ان کو ثابت قدم رکھو۔

ملائکہ کے کام کا دائرہ آیت نے خود متعین کر دیا ہے۔ اس لئے اختلافِ روایات کے اندر، قرآن کریم کے الفاظ کو مدِ نظر رکھنا ہی صحیح اور معیاری طریقہ ہے۔ مثلاً درج ذیل آیت میں " تحسونھم "کا لفظ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونھم باذنہ. (آلِ عمران / ۱۵۲)

''اور بے شک، اللہ نے تمہیں اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، جب تم اس کے اِذن سے انہیں قتل کر رہے تھے''

تحسونھم، اس لفظ میں حس بمعنی قتل کی ضمیر ملائکہ کی طرف نہیں، بلکہ انسانوں کی طرف ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ غزوۂ بدر میں یا کسی بھی غزوہ میں ملائکہ نے قتال میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ اس ضمن میں علامہ غلام رسول سعیدی کا

حوالہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں نے اس مسئلہ میں بہت چھان بین کی ہے اور امہاتِ کتبِ حدیث میں مجھکو فرشتوں کے قتال کے متعلق جس قدر احادیث ملیں، میں نے ان سب کا ذکر کیا لیکن میں نے دیکھا یہ احادیث باہم متعارض اور مضطرب ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے جنگ احزاب میں بھی قتال کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بلکہ کافر بھی فرشتوں کو دیکھ رہے تھے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو قتال کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا، البتہ بغیر کسی فاعل کے کافروں کے سر کٹ کٹ کے گر رہے تھے۔ اس کے برخلاف قرآنِ مجید میں یہ ذکر نہیں ہے کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا بلکہ ظاہرِ قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے قتال کیا تھا اور فرشتے صرف مسلمانوں کی دلجمعی کے لئے نازل ہوئے تھے۔ میرے نزدیک احادیثِ صحیحہ اور آثارِ صحیحہ حُجت ہیں۔ لیکن قرآن مجید بہ ہر نوع احادیث پر مقدم ہے۔ نیز قواعدِ اسلام اور اصول اور درایت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ یہ جنگ صرف مسلمانوں نے لڑی تھی۔ میں نے اس مسئلہ میں دیگر فقہائے اسلام کی آراء کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہر حال میرے قلب وضمیر کے مطابق حق یہی ہے اور اگر حق دوسری جانب ہے تو یہ میری فکر کی غلطی ہے اور میں اس سے تائب ہوں۔''(۸)

تعبیراتِ نصوص کے تعین میں چونکہ الفاظ کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) بعض اوقات الفاظ کے معنیٰ خود کلام کے اقتضیٰ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر معنیٰ کا فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر رباط الخیل کے الفاظ کا معنیٰ ومفہوم درج ذیل آیت میں ملاحظہ کیجئے:

واعدوالهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم واخرين من دونهم ، لاتعلمونهم الله يعلمهم ٥(الانفال / ٦٠)

''اور ان کے (مقابلے کے) لئے تم سے جس قدر ہو سکے، قوت مہیّا کر رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑے بھی تیار رکھو، (اور اس طرح) تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ رکھو اور ان کے علاوہ ان دوسروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ ان کو جانتا ہے''

خیل کا معنیٰ بالعموم گھوڑا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت میں ہے:

زين للناس حب الشهوات من النسآء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث. (النسآ / ١٤)

"لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے، (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیر دں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیت"

امام راغب کے نزدیک، خیل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں پر اکھٹا بولا جاتا ہے اور اس کی وجہ امام راغب نے لفظ خیال سے لی ہے۔ کیونکہ خُیلا، متکبر کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی، جو گھوڑے پر سوار ہو وہ بھی خود کو دوسروں سے بڑھکر خیال کرتا ہے لیکن یہ لفظ سوار اور گھوڑے دونوں پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ (النسآء/۴) سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن سورۂ بنی اسرائیل میں یہ لفظ گھڑ سواروں کے دستہ کے لئے بھی آیا ہے۔

واستفزز من استطعت منهم بصوتك واجلب عليهم بخيلك ورجلك وشاركهم في الاموال والاولاد وعدهم وما يعدهم الشيطان الا غرورا ٥ (بنی اسرائیل /٦٤)

"اور جس پر بھی تیرا بس چل سکتا ہے تو (اسے) اپنی آواز سے ڈگمگا لے اور ان پر اپنی (فوج کے) سوار اور پیادہ دستوں کو چڑھادے اور ان کے مال و اولاد میں ان کا شریک بن جا اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر، اور ان سے شیطان دھوکہ وفریب کے سوا (کوئی) وعدہ نہیں کرتا"

خَیل کا لفظ اسم جمع ہے۔ واحد کے لئے فرس بولا جاتا ہے۔ اس لئے اس لفظ کا معنیٰ لشکر سے بھی کیا جاتا ہے جو گھڑ سواروں پر مشتمل ہو۔ مشکوٰۃ المصابیح کے باب القتال فی الجہاد، فصل ثالث میں ایک روایت نقل ہوئی ہے، جس کے الفاظ میں: **عن ابی هريرة قال بعث رسول الله صلى الله عليه واله وسلم خيلا قبل نجدٍ**۔ (۹) رسول اللہ نے نجد کی طرف کچھ سوار بھیجے۔ نیز اس روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

وان خيلك اخذتني وانا اريد العمرة.

"اور آپ کے لشکر نے مجھے اس حال میں گرفتار کیا کہ میں عمرہ کا ارادہ کررہا تھا" (۱۰)

خیل کے معنیٰ گھوڑا اور سوار دونوں ہیں۔ اور سورۂ انفال میں " واعدوا " کے لفظ سے اس کی تیاری کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اب اگر اسے فقط اسی معنیٰ ظاہر پر محمول کیا جائے تو دشمنوں سے مقابلے کے لئے، حسبِ استطاعت قوت کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی تعداد میں اضافہ کرنا بھی ضروری ہو جائے گا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ، جنگوں میں گھوڑوں کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ اس صورتحال میں خیل کو فقط گھوڑے یا سوار کے معنیٰ میں لینا متعذر ہے۔ چنانچہ ہم اسے کسی ایسے مفہوم میں لیں گے، جو منشائے کلام کے مطابق اور عصرِ رواں کے موافق ہو۔ کیونکہ آیت کا مجموعی مفاد اسی ضرورت کا

متقاضی ہے۔ واضح ہو کہ یہ مفہوم خود کلام کے اقتضاء سے پیدا ہوا ہے۔

مسئلۂ قذف میں قرآنی نصوص کے مطابق چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ نصابِ شہادت پورا نہ ہونے کی صورت میں قاذف کو اسّی کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ اسی طرح مسئلۂ لعان میں، اولاً چار گواہ، بصورتِ تعدیم، چار بار اللہ کی قسم کھانے اور پانچویں بار شوہر کو خود اپنے جھوٹا ہونے کی صورت میں اپنے آپ پر لعنت بھیجنے کا حکم ہے۔ پھر بیوی کا سزائے زنا سے بچنے کے لئے جوابی قسم کھانا ضروری ہے۔ وہ بھی اتنی ہی بار، جتنی بار آدمی نے کھائی تھی۔ اور پانچویں بار آدمی کے سچا ہونے کی صورت میں عورت پر خدا کے غضب کا ذکر کیا گیا ہے۔ (النور/۶-۹)

یہ احکامات بالکل صاف اور واضح ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ میڈیکل سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے سبب کیا پیتھالوجیکل ٹیسٹ اور ڈی این اے ٹیسٹ وغیرہ سے مسئلۂ قذف اور لعان میں کوئی مدد لی جاسکتی ہے؟ اور کیا قرائنی شہادت کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے؟ جدید منہج، اس کا جواب یقیناً ہاں میں دے گا۔ کیونکہ قرآنی شہادت کی مثال خود قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔

وشهد شاهد من اهلها ان كان قميصه قُدمِن قبل فصدقت وهو من الكاذبين o

(یوسف / ۲۶)

''اور عورت کے رشتہ داروں میں سے ایک نے یہ گواہی (یا فیصلہ) دیا کہ اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہو تو وہ سچی ہے اور وہ (مرد) جھوٹوں میں سے ہے''

اس آیت میں قرائنی شہادت کو فیصلے کی بنیاد بنایا گیا ہے پھر اسی بنیاد پر مرد کو بے قصور اور عورت کو قصور وار گردانا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک مخصوص رنگ میں قذف جیسا ہے۔ جس کا فیصلہ عینی شہادت کی بجائے، قرائنی شہادت پر ہوا۔ جو انسانی دانش کی بہت عمدہ مثال ہے۔ پس جب قرائن سے کسی کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کا پتہ چلایا جاسکتا ہے تو میڈیکل ٹیسٹ کی بنیاد پر، جرم کے وقوع یا عدم، وقوع کا پتہ چلانا اور اس پر فیصلہ کرنا، غلط کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ یہ خود قرائنی شہادت کی ایک جدید اور سائینٹیفک صورت ہے۔

جدید منہج کے استدلال پر یہ نقد ضرور ہوسکتا ہے کہ اس طرح تو نصوص، اپنے اطلاقات میں اپنے مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ ناقابلِ عمل ہو جائیں گے۔ مگر یہ اعتراض نظر بظاہر اعتراض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصوص، اپنے منشاء و مقصد کے ساتھ، ایسے خاص قالب میں ڈھلی ہوتی ہیں، جنہیں نصوص کے مقصد کو پورا کرنے کیلئے ہی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن زمانے کے تغیر سے اگر منشائے نصوص کو، کسی دوسرے ذریعے سے پالیا جائے تو فقط ''قالب'' کی تکمیل پر اصرار کرنا، کیا منشائے نصوص کی پامالی کا ذریعہ نہیں بن سکتا؟ ہمارے نزدیک جدید منہج میں بھی منشائے نصوص کی حفاظت اور اس کے مؤثر

نفاذ کا لحاظ مضمر ہے، جسے نظر انداز کرنا، خود قرآنی منشاء کے منافی اقدام معلوم ہوتا ہے۔

اور آخر میں ایک اہم بات، جو خود ایک تفصیلی مقالے کی متقاضی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کو جب مکمل ضابطۂ حیات اجتماعی یا نظامِ حیاتِ کلی قرار دیا جاتا ہے تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں ہر وہ چیز موجود ہے، جس کی انسان کو بحیثیت فرد کے اور بطور سماج کے، سخت ضرورت ہے۔ قرآن نے اپنی ہدایت کو نہ صرف مکمل بلکہ مفصل بھی کہا ہے۔ مفصل کا مطلب ہے کہ قرآن ہر اعتبار سے کامل و مکمل ہے۔ پس جو کتاب تکمیل سے عبارت ہو، وہ اپنی توضیح کے لئے اصلاً کسی دوسری کتاب کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے؟ محققین کے نزدیک، قرآن مجید کی مکمل اور صحیح تفہیم، اسی بنیادی حقیقت پر استوار ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کی تشریح میں غیر از قرآن چیزوں کو فیصلہ کن عامل قرار دے کر قرآن پر حُجت ٹھہرایا ہے انہوں نے قرآن کو مفصل سمجھنے کی بجائے، مجمل جانا ہے اور تبھی انہوں نے قرآن کو قرآن سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں شروع ہی سے دو نقطۂ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کا ہے۔ یہ نقطۂ نظر قرآن کو مکمل و مفصل کتاب سمجھنے والوں کا ہے۔ جبکہ دوسرا، قرآن کو روایات کے تابع کر کے سمجھنے کا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اصلاً قرآن کو اپنی ذات میں غیر مکتفی اور غیر مفصل سمجھنے سے عبارت ہے۔ گو وہ اپنے حق میں تاویلاً کچھ بھی کہتا رہے۔ مگر بات اصل میں یہی ہے۔ قدیم اور جدید منہج کے اس فرق کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ قدیم اور جدید منہج کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو بادی النظر سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک مفہوم اور ہے جو دقتِ نظر سے ظاہر ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ روایت اور جدیدیت کی تقسیم زمانوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ نقطۂ ہائے نظر کے اعتبار سے ہے۔ اس میں عام تعبیرات کو روایتی منہج جبکہ خاص اور مدبرانہ تعبیرات کو جدید منہج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں مناہج، اپنی پیدائش میں ہمعصر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ جو آج بھی تسلسل کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن مجید نے خود کو ایک جگہ فصل (الانعام/۱۱۹) تین جگہ فصلنا (الانعام/۹۷۔۹۸۔۲۶) دو جگہ فصلناہ (الاعراف/۳۲، الاسرا/۱۲) چھ جگہ نُفصّل (الانعام/۵۵۔ الاعراف/۳۲۔۴۷، التوبہ/۱۱۔ یونس/۲۴، روم/۲۸) دو جگہ تفصیل (یونس/۳۷۔ یوسف/۱۱۱) تین جگہ تفصیلا (الانعام/۱۵۴۔ الاعراف/۱۴۵۔ الاسراء/۱۲) ایک جگہ مفصلا (الانعام/۱۱۴) اور ایک جگہ مُفصّلات (الاعراف/۱۳۳) کہا ہے۔ یہ کل چوبیس حوالے ہیں۔ جبکہ قرآن نے کسی ایک جگہ بھی خود کو مجمل نہیں کہا۔ جدید منہج میں، قرآن مجید کے مفصل ہونے کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے جبکہ قدیم یا روایتی منہج میں یہ اصول کام ہی نہیں کرتا۔

☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

۱۔ جیسے احکام کی علتوں میں اختلاف کی مثال، مسئلۂ یمین (قسم) میں کچھ اس طرح سے دی گئی ہے۔ امام شافعی کے ہاں قسم کا دارومدار، لغت پر ہے۔ جبکہ امام مالک کے ہاں قرآنی آیات پر اور امام احمد بن حنبل کے ہاں نیت پر، جبکہ احناف کے ہاں عرف پر ہے۔ (بشرطیکہ قسم کھانے والے نے کسی ایسے لفظ سے نیت نہ کی، جو محتمل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ اگر کوئی شخص یوں کہے واللہ لا اھدم بیتا۔ خدا کی قسم میں کسی گھر کو منہدم نہیں کروں گا تو امام شافعی کے ہاں بیت العنکبوت (مکڑی کا گھر) توڑنے سے بھی حانث ہو جائے گا۔ کیونکہ لغت میں مکڑی کے جالے کو بیت کہتے ہیں۔ اگر کوئی یوں کہے۔ واللہ لا اکل لحماً۔ خدا کی قسم میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ تو امام مالک کے ہاں مچھلی کھانے سے حانث ہو جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں مچھلی کو لحم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لتاکلوا منہ لحماً طریا۔ (النحل/۱۴) (تاکہ تم اس سے (یعنی سمندر سے) مچھلی کا تازہ گوشت کھاؤ) اگر کوئی یہ کہتا ہے۔ واللہ لا ادخل بیتا۔ خدا کی قسم میں کسی گھر میں داخل نہیں ہوں گا تو احناف کے نزدیک یہ کہنے والا، اگر خانہ کعبہ میں، یا کسی مسجد میں یا کنیسہ میں داخل ہو گیا تو حانث نہ ہوگا۔ کیونکہ عرف میں بیت اس کو کہتے ہیں، جو مستقل اپنے بسنے سے عبارت ہو یا رات گزارنے کے لئے بنایا گیا، جبکہ عبادت گاہیں، عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ (الصبح النوری اردو شرح مختصر القدوری، تالیف مولانا محمد حنیف گنگوہی، جلد دوم، کتاب الایمان، ص ۲۶۱، کتب خانہ مجیدیہ، ملتان، سن اشاعت ندارد)

۲۔ المفردات فی لغت القرآن کتاب الرّا۔

۳۔ English. Arabic Lexicon printed by LIBRAIRIE DU LIBAN, Riad Solh square, BEIRUT. 1967.

۴۔ The last message, Publisher : waliyat sons, Lahore, Pakistan, year unknown.

۵۔ مطبوعہ: دار الثقافۃ الاسلامیۃ، پاکستان، سن اشاعت ندارد۔

۶۔ کِنگ فھد، ہولی قرآن، پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، پی او بکس 3561، المدینہ منورہ۔

۷۔ مجموعۂ قوانین اسلام۔ (قانونِ ازدواج) جلد اول، ص ۹۵، زیرِ دفعہ ۸، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیۃ، اسلام آباد، (پاکستان) اشاعت سوم، 1987ء

۸۔ تبیان القران، جلد دوم، ص ۳۵۴، الطبع الثانی 2001ء، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور۔

۹۔ مراۃ المناجیح اردو ترجمہ وشرح مشکوۃ المصابیح، جلد پنجم، مفتی احمد یار خان نعیمیؒ، ص ۵۳۳، ضیاء القران، پبلی کیشنز، لاہور، سن اشاعت درج نہیں۔

۱۰۔ ایضاً ص ۵۳۶۔